eISSN:2073-3674
pISSN:1991-7813

وارث علوی بحیثیت منٹو شناس

("منٹو ایک مطالعہ" کے تناظر میں)

Waris Elvi as a Critic of Manto in the light of " Manto aik Mutala"

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین، شعبۂ اردو، جامعۂ پشاور
Dr. Robina Shaheen　　Email: Rubinauni@uop.edu.pk
Professor, Dept. of Urdu, University of Peshawar.
ڈاکٹر انتل ضیاء، شعبۂ اردو، جامعۂ شہید بینظیر بھٹو برائے خواتین، پشاور
Dr. Antal Zia　　Email: antalzia@sbbwu.edu.pk
Assistant Professor, Dept. of Urdu, Shaheed Benazir Bhutto Women University, Peshawar

Received:16-2-2022**Accepted:**20-3-2022**Online:**28-6-2022

ABSTRACT

Waris Alvi, is a well-known Urdu critic with a remarkably different take on literature from that of his contemporary critics and a style of writing devoid of scholarly airs. Far away from the known centers of Urdu in India, he lives in Ahmadabad, writing both in Urdu and Gujrati. Alvi talks about those short story writers who wrote with an acute awareness, highlighting social realities, human vagaries and inherent human tragedies. These writers, he says, were not opposed to social realism. Waris Alvi is a big name in Urdu criticism. With regard to the critical profession, he did not belong to a single ideology, but benefited from different critical ideologies, and thus he has a mixed attitude. Although Waris Alavi examines and presents his subject with great logic and attention, but this balance is not maintained in the case of Manto. Waris Alavi's attitude has been one of devotion for Manto, so he has also presented the limitations and weaknesses of Manto as a masterpiece.

KEYWORDS: Beliefs Combination, Pashmina, Adolescence, Sensation, Psychological, Technique, Consciousness, Insult, Customer, Perversion.

کلیدی الفاظ: بنظرِ غائر، عقائد، امتزاجی، پشمینے، لڑکپن، سنسنی، نفسیاتی کیس، دانش ورانہ،

تکنیک، شعور، ہتک، گاہک، پرورژن، واشگاف

وارث علوی اردو تنقید کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ تنقیدی مسلک کے حوالے سے وہ کسی ایک نظریے یا دبستان سے وابستہ نہیں بلکہ مختلف تنقیدی نظریات اور تنقیدی دبستانوں سے مستفید ہوئے اور اس طرح ان کے ہاں ایک امتزاجی رویہ پایا جاتا ہے۔ بہ نظر غائر ان کے تنقیدی نظریات اور رجحانات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے ہاں میتھو آرنلڈ، ڈرائڈن، حسن عسکری اور سلیم احمد کی بازگشت فکری کے حوالوں سے ملتی ہے۔ وارث علوی نے اپنی تنقیدی آرا کو مستند حوالوں سے ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، جس سے ان کی تنقید میں تیقن کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ وہ قاری اور تخلیق کار کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ وارث علوی نے ہر منزل پر فن کو مقدم رکھا ہے۔ انھوں نے ادب پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ ادب دوست تو ہے ہی، ساتھ میں ادیب دوست بھی ہیں۔ وہ قاری کو انگلی سے پکڑ کر اپنے ساتھ سفر پر لے چلتے ہیں چاہے وہ "حالیؔ مقدمہ اور ہم" ہو یا پھر "منٹو ایک مطالعہ"۔ وہ اپنے قاری کو ایک نئے مفہوم اور ذہنی جستجو سے ہمکنار کرتے ہیں۔ وہ قاری کو اپنا ہم نوا بنا دیتا ہے اور یہ تخلیقی فنکار کا کام ہے۔ افسانوی ادب کے تنقیدی زاویے وہ یوں وا کرتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ نہ صرف افسانوی ادب بلکہ پورے ادب یعنی نثر و شاعری کی تفہیم کے دوران وارث علوی کا دائرۂ کار وسیع رہتا ہے۔ وہ ادب کو سماج، نفسیات، تہذیب و ثقافت، رسوم و رواج اور عقائد کے پس منظر میں دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ نقاد کے لیے لچک، استدلال اور تحمل بنیادی خوبیاں ہیں۔ وارث علوی کا اندازِ تنقید تجزیاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ادب کو بھی محدود نہیں کرتے بلکہ ادب کا مکمل اور وسیع دائرہ نقد و نظر میں سامنے لاتے ہیں۔ وہ خود اپنی تنقیدی نظامِ فکر کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

> "میرا تعلق امتزاجی تنقید سے ہے جس میں ضرورت کے مطابق ہر طریقہ تنقید کا اپنی علمی حیثیت کے مطابق استعمال کیا جاسکتا ہے۔" [۱]

وارث علوی نے زندگی کے حقائق، تجربات اور مشاہدات کو تنقید کے لیے اہم عنصر کے طور پر لیا اور ان کی روشنی میں فن پارے کو پرکھا اور ادیب اور ادب پارے کا تجزیہ پیش کر کے اس کا ادبی مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ وارث علوی اپنے موضوع کو بہت استدلال اور توجہ سے پرکھتے اور پیش کرتے ہیں لیکن منٹو کے ضمن میں ان کا توازن برقرار نہیں رہتا۔ وہ منٹو سے عشق کرتے ہیں اور اسی لیے غیر جانبداری کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی وارث علوی کا رویہ منٹو سے عقیدت اور عشق کا رہا ہے اس لیے انھوں نے منٹو کی خامیوں اور کمزوریوں کو بھی شاہکار کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ منٹو کے

حوالے سے فکری اور سماجی رویوں کی مسلسل تلاش اور وضاحت میں کوشاں نظر آتے ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وارث علوی نے منٹو پر جو کچھ لکھا، اس میں منٹو زیادہ نظر آئے گا۔ "منٹو ایک مطالعہ" میں وارث علوی نے منٹو کی شخصیت اور زندگی پر جس خوبصورتی اور وضاحت سے لکھا ہے وہ مثالی ہے۔ ابتداء میں لفظ منٹو کی وضاحت کی ہے اور برج پریمی سے استفادہ کرتے ہوئے منٹو کے نام، ذات اور شخصیت کی وضاحت پیش کی ہے اور منٹو کی شخصیت کو نفسیاتی بنیاددوں پر تلاش کی۔ وارث علوی کے توضیحی انداز سے منٹو کی شخصیت کے تمام عوامل جو شخصیت کی تکمیل میں کار فرما ہے، سامنے آجاتے ہیں۔ جیسا کے وارث علوی لکھتے ہیں۔

"منٹو کا آبائی خاندان اٹھاروی صدی کے اواخر میں کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آیا اور لاہور میں سکونت اختیار کی۔ اس سلسلہ میں بیگم صفیہ منٹو نے ڈاکٹر برج پریمی کو جو تفصیلات مہیا کی ہیں وہ یہ ہیں۔" اس خاندان کے پہلے بزرگ جو پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں آکر مقیم ہوئے خواجہ رحمت اللہ تھے۔ پیشہ سوداگری تھا اور اہل اللہ سے گہری محبت رکھتے تھے۔ ان کے پوتے خواجہ جمال الدین نے کاروبار کو بہت فروغ دیا اور اسے لاہور، امرتسر اور بمبئی میں پھیلا دیا۔ امرتسر بہ وجہ دربار صاحب سکھوں کا مقدس مقام تھا۔ اس لیے خواجہ صاحب لاہور چھوڑ کر امرتسر میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔ ان کا بیوپار پشمینے کا تھا۔ خواجہ جمال الدین منٹو کے دادا تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے کا نام مولوی غلام حسن تھا جو منٹو کے والد بزرگوار تھے "۲؎

منٹو کے خاندان حسب نسب پر بات کرتے ہوئے، منٹو کے خاندان ماں باپ سے ان کے تعلقات بالخصوص باپ سے ان جذباتی تعلق جو فطری تھا لیکن ہمدردی اور شفقت سے محرومی کی بناپر خود منٹو کو ایک جذباتی اور نفسیاتی خلاُ دے گیا۔ اسی طرح منٹو کا وادئ عشق میں پہلا قدم بھی قابل توجہ ہے۔

"منٹو کے والد بھی کشمیریوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ منٹو کو بھی اپنے کشمیری ہونے پر فخر تھا اور اگر انہیں کوئی کشمیری مل جاتا تو اپنے والد ہی کی مانند اس سے گرم جوشی سے ملتے اور اسے بتلاتے کے میں بھی کشمیری ہوں، ویسے امرتسری ہوں۔ کشمیر سے والہانہ محبت کے باوجود منٹو زندگی بھر کشمیر نہ جاسکے۔ ان کا سفر بٹوت تک رہا جہاں تب دق کے علاج کے لیے انھیں چند مہینے قیام کرنا پڑا تھا عطا۔ یہیں انھیں ایک آوارہ کشمیری چرواہی لڑکی سے رومانی قسم کا انس ہو گیا تھا جو ان کا پہلا اور آخری اور انہی کے الفاظ میں ناپختہ معاشقہ تھا۔ اس کی یاد ان کے چند

ابتدائی اور اتنے ہی ناپختہ افسانوں میں محفوظ ہے۔ رومانی محبت پر منٹو کے یہاں ان افسانوں کے علاوہ کوئی دوسری اہم تحریر نظر نہیں آتی۔ زندگی میں کوچہء عشق اور ادب میں وادیٔ رومان سے وہ بہت جلد باہر نکل آئے "۳

منٹو کے بچپن لڑکپن کے تمام حالات و واقعات کو وارث علوی ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ والد کی ہمدردانہ شفقت سے محرومی کا اثر بھی بیان کرتے ہیں تو ان کی والدہ "بی بی جان" کی تربیت اور توجہ پر بھی بات کرتے ہیں۔ منٹو کی شادی صفیہ بیگم سے بمبئی میں ہوئی اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ہجرت کی وجوہات اور منٹو کے دہلی اور بمبئی کے حالات کی بھی تصویر پیش کی ہے۔ یوں منٹو سے اپنی دلچسپی کا ثبوت یوں دیتے ہیں جیسے ایک حرکی فلم پردہ سمیں پر پیش کی جاتی ہے۔ وہ باریک سے باریک تفصیل سے ایک مکمل تصور بنانے کی کوشش میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔ عشق اور والہانہ پن انسان س ایسے ہی کام کراتا ہے۔ منٹو کے صرف افسانے ہی نہیں بلکہ ڈرامے اور مضامین بھی وارث علوی کا موضوع ہیں۔ ایک قابلِ قدر ذخیرہ اس ضمن میں موجود ہے چنانچہ ان کا تجزیہ قابل ستائش وتوجہ ہے۔

"منٹو نے لگ بھگ سو کے قریب ڈرامہ لکھے جو باقاعدگی سے ریڈیو پر نشر ہوتے رہے۔ جب ریڈیو سے تعلق نہ رہا تو ڈرامے کی طرف طبیعت بھی مائل نہ ہوئی۔ منٹو مکالمہ نویسی میں مشاق تھا۔ بات سے بات پیدا کرنا، بات کا بتنگڑ بنانا، بات چیت کو بحث میں، کاروباری گفتگو کو جھڑپ میں، میاں بیوی کی نوک جھونک کو جھگڑنے میں اور جھگڑے کو دلچسپ ڈرامے میں بدلنے کی سب گُر اسے یاد تھے۔ منٹو کے ابتدائی ڈرامے جو "تین عورتیں" اور "آؤ" نام کے مجموعوں میں شامل ہیں، مکالموں کے زور پر تحریر کیے گئے ہیں۔"۴

وارث علوی نے منٹو کے ڈراموں کے پلاٹ، کہانی اور کرداروں کو الگ الگ سمجھنے کی سعی کی ہے اور منٹو کے ادبی شعور کی تفہیم کی دعوت دی ہے۔ منٹو اپنے افسانوں اور ڈراموں سے متعلق خطوط میں بھی تذکرہ کیا ہے اور اس تذکرے سے ان فن پاروں تک رسائی کی ایک واضح جہت مل جاتی ہے۔

منٹو کے افسانوں کی طرح ان کی خاکہ نگاری بھی سنسنی اور دلچسپی سے خالی نہیں۔ خاکہ ایک مشکل ترین فن ہے جو کسی بھی پیش کردہ کردار کے نمایاں اور نمائندہ سے مل کر بنتا ہے۔ یعنی نمایاں خدوخال اور نمائندہ واقعات سے شخصیت کو سامنے لاتے ہیں۔ وارث علوی کا خیال ہے کہ شخصیت پرستی لوازمات کو سامنے رکھا ہے اور لگی لپٹی بغیر راست گوئی سے کام لیا ہے۔ لیکن محض راست گوئی بھی کافی نہیں خاکہ کا فن نہایت نازک ہے اور خاکہ نگار کو فنکارانہ مہارت

درکار ہے۔ وارث علوی نے منٹو کے خاکوں میں سے پری چہرہ، نسیم بانو، قائد اعظم، عصمت اور چراغ حسن حسرت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ منٹو کرداروں کے ذریعے فرد کے باطن میں جھانکتا ہے اس لئے ان کے خاکوں میں بھی افسانوں کے کرداروں کی طرح خیر و شر کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ منٹو ایک جذباتی انسان اور کئی مقامات پر معروضی فنکار ہے۔ وہ خاکہ لکھتے ہوئے کردار کے باطن میں اترنے کا فن جانتا ہے اور وارث علوی کے مطابق منٹو کے کئی افسانے بھی خاکہ نگاری کے زمرے میں آتے ہیں۔ وہ کردار کشی کرتے ہوئے دراصل خاکہ لکھ رہا ہوتا ہے مثلاً گوپی ناتھ، ممد بھائی، بھائی شاردا، ہتک کئی ایسے افسانے ہیں جن کے مرکزی کردار خاکہ نگاری کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ اردو ادب میں کردار نگاری سے خاکہ نگاری کی یہ منازل اور بھی کئی افسانہ نگاروں کے کہاں مل جاتی ہیں، لیکن منٹو کا کمال یہ ہے کہ وہ نفسیاتی، معاشرتی اور خود فرد کی جنسی مسائل کا تجزیہ یوں کر پاتا ہے کہ افسانے اور حقیقت میں فرق مشکل ہو جاتا ہے۔ افسانہ میں جو انسانی رنگ ہے وہ خاکہ بن جاتا ہے اور خاکہ کے دوران سے افسانہ نکلتا ہے، یہ معراج فن صرف منٹو کو ہی نصیب ہو سکی۔ وارث علوی کا یہ لکھنا قابل توجہ ہے۔ منٹو کی خاکہ نگاری کے حوالے سے قیسم اختر کچھ یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

> "منٹو نے خاکہ نگاری کا اصول ہی بدل دیا۔ وہ اپنے افسانوں کی طرح اپنے خاکوں میں بھی بے باک نظر آتا ہے۔"۵

وارث علوی کا یہ لکھنا قابل توجہ ہے۔

> "اخلاقی سلیقہ مندی منٹو کے تمام خاکوں میں موجود ہے حتیٰ کہ پراسرار نینا اور ستارہ کے خاکوں میں بھی جہاں اخلاقی احتساب کا کاری وار پڑھ سکتا تھا اور نیک و بد میں ہمدردیاں تقسیم ہو سکتی تھیں ستارہ کو منٹو ایک نفسیاتی کیس کے طور پر بیان کرتا ہے اور پراسرار نینا میں، محسن عبداللہ، نینا اور ڈبلیو زیڈ احمد کو ان کی کمزوریوں کے ساتھ پیش کرنے کے باوجود کسی کے منہ پر کالک ملتا یا کسی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا نظر نہیں آتا۔"٦

خاکہ نگار پیش کردہ شخصیت میں اپنی شخصیت کی یکساں خواہشات بھی دیکھتا ہے مثلاً مولوی عبد الحق کے لکھے گئے خاکوں میں پیش کردہ کردار ان کے آئیڈیل ہی نہیں، ان میں خود عبد الحق کا پرتو بھی دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح منٹو کی کی زندگی کے بہت سے پہلو اُن کی خاکہ نگاری سے عیاں ہوتے ہیں۔

> "خاکے منٹو نے انہیں شخصیتوں پر لکھے ہیں جن سے وہ براہ راست رابطہ قائم کر سکتا تھا، سوائے محمد علی جناح کا خاکہ جو جناح کے ڈرائیور کے تاثرات پر مبنی ہے۔

اس وجہ سے ان خاکوں میں خود منٹو کی زندگی کے متعلق بہت سی تفصیلات مل جاتی ہیں۔ خصوصاً لاہور، امرتسر، دہلی، ممبئی اور پونا میں اس کی زندگی کے شب و روز کے متعلق سوائے محمد محسن کے ان تفصیلات کا منٹو کے کسی اور سوانح نگار نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس وقت کی تہذیبی اور دانشورانہ زندگی پر ادب، صحافت، ریڈیو اور فلم کی اجارہ داری تھی اور منٹو کا تعلق ان تمام شعبوں سے تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان سرگرمیوں کے جو مراکز تھے صحافت کا لاہور، ریڈیو کا دہلی اور فلم کا بمبئی۔ منٹو کا ان شہروں کے ساتھ گہرہ رشتہ رہا۔ وہ اردو کے چھوٹے بڑے ادیبوں سے، نامور صحافیوں سے، ریڈیو کے آرٹسٹوں اور فلمی دنیا کے نامور ایکٹروں سے لے کر اسٹوڈیو کے ادنیٰ ملازموں تک سے واقف تھا۔ خاکہ نویسی کیلئے ضروری ہے کہ حافظہ تیز ہو، سکینڈلز میں دلچسپی ہو۔ گپ شپ میں ضروری معلومات حاصل کر لینے کی صلاحیت ہو اور یہ تمام دلچسپیاں بے مقصد ہو۔ منٹو کے خاکے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہر شعبہ میں اس کی معلومات کتنی وافر تھی۔ کیا فٹا فٹ اسے اداروں اور ایجنسیوں اور راستوں مکانوں اور شخصیتوں کے نام یاد آجاتے ہیں۔ وہ آدمی جو جانتا ہو اور خوب جانتا ہو اس کی سنگت میں ہمیں انجانی دنیائوں کی سیر کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔"[۷]

منٹو کی تخلیقی جہات میں قدر مشترک منٹو کی بے باکی ہے جو ہر صنف میں دکھائی دیتی ہے۔ منٹو ایک ہمدرد دل رکھنے والا، دوستی نبھانے والا اور محبت کرنے والا انسان تھا۔ اس کی ذات کی یہ صفات اُس کی تخلیق میں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ منٹو نے چاہے دوستوں کے خاکے لکھے، بڑھتی شخصیات کے یا پھر فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے سب سے صاف گوئی کے ساتھ جو دوسری اہم صفت نظر آتی ہے، وہ انسان دوستی ہے۔ وہ انسان سے محبت رکھتے ہیں اور اندر باہر کے انسان کا عکس دکھانے کی کوشش میں کسی کی برائی یا کمی کو اچھالتے نہیں۔ منٹو کے افسانوں میں حیات اور موت کی کشمکش کے عنوان سے وارث علوی نے ایک جاندار اسلوبِ بیان کے ذریعے منٹو کا مطالعہ پیش کیا ہے اس مضمون کی ابتدا انتہائی جاندار ہے وہ لکھتے ہیں۔

"بڑا جواری بڑا داؤ لگاتا ہے اور منٹو نے بڑا جوا کھیلا۔ جب اس نے فیصلہ کیا کہ ہر نو کی آرائش و زیبائش، جزئیات اور تفصیلات سے معرا محض سیدھی سادھی کہانی اس کے تخیلی تجربہ اور تخلیقی اظہار کا پورا بار اٹھائے گی۔ اب جہاں تک خالص کہانی کا تعلق ہے تو ان میں دلچسپی بیدی کے بولا اور شہر زاد کے شوہر یعنی فارسٹر

کے الفاظ میں بچوں اور وحشیوں کو ہوتی ہے۔ ایلیٹ نے بھی بتایا ہے کے خالص ناول نگار تو فرانس میں سراغ رسانی کے ناول لکھنے والا simenenon جس نے ہر نو کی تفصیل تفصیل سے ناول کو ایسا برہنہ کیا کہ وہ محض ناول کا ڈھانچہ رہ گیا یا دلچسپ اور خوبصورت لیکن محض فریم ورک۔۔۔۔۔۔۔

اپنے بہترین افسانوں میں منٹو کا بیانیہ حشو وضوابط سے پاک ہو۔ ایک تندرست بدن کی جلد کی مانند، کہانی کے ڈھانچے پر ایسی تندہی سے کسا ہوا ہے کہ بیانیہ کا ہر جز پورے افسانوی ڈیزائن کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے، اس حد تک کے افسانوی معنویت افسانوی ڈیزائن سے کوئی الگ چیز نہیں رہی منٹو کے افسانوں میں ہر تفصیل کی وہی اہمیت ہے جو غنائی نظم میں لفظوں کی آہنگ شعری پیکر اور علامت کی ہوتی ہے، جو باہم مل کر معنی کی تقسیم کرتے ہیں۔"۸

وارث علوی کے یاں تنقید کی زبان خشک اور بے رنگ ہونے کی بجائے تخلیقی رنگ سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ وارث علوی نے تنقید کے لئے ضرورت کے تحت اندازِ بیان اختیار کیا ہے، جہاں سنجیدہ اور عالمانہ انداز کی ضرورت ہے وہاں وہی رنگ اپناتے ہیں اور جہاں ظریفانہ اور عامیانہ پن درکار ہے تو وہی جھلک ملتی ہے۔ منٹو پر ان کی تنقیدی رائے کا اسلوب انتہائی سنجیدہ اور عالمانہ ہے۔ افسانے میں سنسنی خیزی کے حوالے سے وارث علوی کہتے ہیں کہ عام طور پر سنسنی خیز کہانی میں تشدد عمل کا بدل بن جاتا ہے، تشدد میں کردار بھول جاتا ہے کہ وہ کون ہے۔ حساسیت کی کہانیاں لکھنے کا منٹو کے ہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ سفاک حقیقت نگار ہیں۔ منٹو نے اپنے افسانے میں ڈرامائی تکنیک کا استعمال کیا ہے، جس میں معروضیت زیادہ اور مصنف کا عمل دخل کم ہوتا ہے۔ اس حوالے سے وارث علوی لکھتے ہیں۔

"ڈرامائی معروضیت کو قائم رکھتے ہوئے وہ اپنے افسانے کی تعمیر ہی اس طرح کرتا ہے کہ جو لوگ بدی، بدکاری، شر اور پر ورژن کے شکار ہیں، اُن کی طرف ناپسندگی پیدا ہوتی ہے اور ایسے لوگوں کے ہاتھوں جن بے گناہ لوگوں کی زندگیاں تباہ ہوتی ہیں اُن کے لیے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ "سرکنڈوں کے پیچھے" اس کی بہترین مثال ہے"۹

منٹو ایک مطالعہ میں وارث علوی "جنسی نفسیات اور پرورژن کے افسانے" کے عنوان سے منٹو کی مرد اور عورت کے رشتہ اور اس کی مختلف صورتوں پر بات کرتے ہوئے انسانی نفسیات کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔ منٹو کا تجزیہ کرتے ہوئے وارث علوی نے منٹو کے سارے تخلیقی سرمائے کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اپنی ایک واضح رائے قائم کرنے کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ منٹو

کے موضوعات کا تعین کرتے ہوئے ان کا یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کے زیادہ تر افسانوں میں نچلے طبقے کے مسائل پیش ہوئے ہیں۔ ایک معروضی فنکار کی طرح وہ حقیقت، فطرت اور جبلت کا واضح رنگ سامنے لانے پر قادر ہوتا ہے۔ وارث علوی منٹو پر لگائی گئی چھاپ اور تنقیص کا بھی جواب دیتے ہیں۔

> "جہاں منٹو کے یہاں انسان کی فطری معصومیت کا گہرا شعور ہے وہی وہ انسان کی خباثت، حیوانیت اور شر کی قوتوں کی بھی بصید آگہی رکھتا ہے۔ شر کا ڈرامہ دیکھنے کے لیے اُس نظر کی ضرورت ہے جو چکرائے اور گھبرائے بغیر ٹکٹکی باندھ کر اُس کا مشاہدہ کر سکے، منٹو کے پاس یہ نظر تھی۔ جذباتی افسانوں کے قارئین اس نظر کی سنگین معروضیت کی قدر نہیں پہچان سکے اور اس پر سنسنی خیزی اور جرائم سے رغبت کے الزامات تراشتے رہے۔" [۱۰]

وارث علوی منٹو سے بے پناہ متاثر نظر آتے ہیں لیکن ان کا استدلالی انداز منٹو کو ہر جگہ حق بجانب سمجھنے پر قاری کو مجبور کر دیتا ہے۔ انہیں افسانہ "بابو گوپی ناتھ" بہت پسند ہے. "منٹو ایک مطالعہ" ہو یا "دو ادیب" دونوں تنقیدی کتب ہیں۔ وہ بار بار "بابو گوپی ناتھ" کا تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ "بابو گوپی ناتھ" کو کردار نگاری کی معراج قرار دیتے ہوئے اس کے باطنی احساسات اور خارجی اعمال کو جوڑتے ہیں۔ وارث علوی کے خیال میں یہ ایک "الوہی" کردار ہے جس کی روح کی پاکیزگی کو عام معاشرہ نہیں سمجھ سکتا اور وہ معرفت کے اس درجہ پر ہے کہ ہر شے سے بے نیاز صرف عشق میں فنا ہے۔ اسی طرح انہوں نے "ہتک" کی سوگندھی کی تصویر کشی کو بے حد سراہا ہے۔ افسانہ میں کی گئی تصویر کشی میں محاکات جیسی دلکشی ہے۔ سنگھار میز پر رکھا ہوا معمولی میک آپ کا سامان، سامنے گنیش جی کی تصویر میں پڑے باسی پھول، ایک پنجرا میں طوطا جس کا ادھ کھایا سیب سیاہی مائل ہو چکا ہے اور اس پر مچھروں نے ڈھیرہ ڈالا ہے۔ ادھر ایک کتا دروازے کے پاس بیٹھا ہے جیسے پاؤں صاف کرنے والا تولیا ہو۔ کمرے کی وقعتی دراصل خود "سوگندی" کی بے وقعتی کا اظہار ہے لیکن معمولی چیزوں کا بیان ہمیں اصل واقعہ سے ہٹاتا نہیں بلکہ اور قریب لاتا ہے۔ وارث علوی نے جزئیات کے ساتھ اس افسانہ کی پرکھ ایسے کی ہے جیسے کسی غزل کے اشارے علائم استعارے، تشبیہات اور آمریت بیان ہو۔ افسانہ کا اصل نقطہ "ہتک" ہے کہ ایک رات جب سوگندی جو ڈھلتی عمر کی ایک طوائف ہے، جسے اب زندگی میں اندھیرا نظر آرہا ہے، اسے ایک بڈھے بدصورت سیٹھ کی "اونہہ" سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ "اونہہ" وہ ایک خاص لمحہ ہے جس میں سوگندھی ایک فرد کی حیثیت سے اپنی ہتک محسوس کرتی ہے۔ دیگر کئی ناقدین اس ایک خاص لمحے کو گرفت میں

نہیں لا سکے مثلاً عابد علی عابد اسی افسانہ کو ایک معمولی افسانہ سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ سوگندی کی وجود باطنی میں کوئی خود دار عورت نہیں، اُسے اس بات کا عادی ہونا چاہیے کہ کوئی گاہک اسے پسند کرتا ہے اور کوئی رد۔ اس میں ہتک والی کونسی بات ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"کسی گاہک کا یہ کہنا کہ مجھے یہ مال پسند نہیں۔ دکان دار کے لیے پریشانی کا موجب ہو سکتا ہے۔ ہتک کا نہیں۔ مختصر یہ کہ جس چیز پر سوگندھی کو غصہ آیا ہے۔ اس سے سوگندی کاملاً آشنا ہے۔ اُسے ہزاروں بار ٹارچ کی روشنی میں گاہکوں نے رد کر دیا ہے۔ یہ واقعہ اتنا عام ہے کہ اب سوگندی کے لیے اس میں ہتک کا کوئی پہلو باقی نہیں رہنا چاہیے۔"[۱۱]

مثلاً کسی دکاندار کو گاہک ہے کہ پینسل وہ بھیج رہا ہے وہ اچھی نہیں تو اس میں دکاندار کی تشویش کی بات تو ہے مگر بے عزتی کا کوئی پہلو نہیں ہسپانوی لکھتے ہیں عابد علی عابد یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ جو گندی نسل نہیں ایک جیتی جاگتی کتی گوشت پوست کی انسان ہے وہ لاشعور میں یہ خوف چھپائے بیٹھی ہے کہ اس کی ڈرتی عمر کے اس دھندے کا سہارانہ دے پائیں گی ایسے میں جب سیٹ کی انہیں سختی ہے تو اسی لمحہ اسے اپنے وقت ہونے کا شدید احساس ہوتا ہے جس کے رد عمل میں وہ گالیاں دیتی ہے اور پتھر اٹھا کر دور بھاگتی سیٹ کی موٹر کا کاپتی ہے سوگندی صرف جنسی نہیں جو بکتی ہے بلکہ ایک انسان ہے اور منٹو نے انسان کی اس کمزور لمحہ کو سپورٹ کیا ہے اس فرق کو سمجھنے والا وارث علوی جیسا احساس اس دن بھی ہو سکتا ہے جو اس مخصوص لمحہ کا احاطہ کر کے اس کی ایسی وضاحت، تشریح کرتا ہے جو قاری کا دل موہ لیتا ہے

وارث علوی منٹو کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ پرورژن پر لکھے گئے منٹو کے افسانوں میں پرورژن کا بیان واشگاف نہیں بلکہ ڈھکے چھپے انداز میں اشاروں کنایوں میں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منٹو اردو کا واحد افسانہ نگار ہے جو زندگی میں جنس کی طاقت کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ وہ نہ تو جنس کا مبلغ ہے اور نہ فلسفی وہ خیر و شر، نیک و بد جیسا ہے ویسا اُسے پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کے جنس کے مختلف رویوں یعنی مثبت اور منفی حوالوں سے سماج میں کیا الجھنیں اور المناکیاں پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح منٹو کے افسانوں میں عورت کا کردار کے عنوان سے وارث علوی منٹو کے افسانوں میں عورت کے مختلف رنگ اور روپ کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں ہر عمر کی عورت نظر آتی ہے، منٹو نے عورت کو طوائف کے روپ میں پیش کیا ہے مگر اس انداز سے کے کہیں پر عورت کی ذات کی تذلیل نہیں کی۔ منٹو کی عورت کا بنیادی مسئلہ جنس نہیں ذات کی تنہائی ہے جس کو منٹو نے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر پرویز شہریار اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

"منٹو کی عورت بیک وقت منفی اور مثبت دونوں قدروں کی متحمل ہوتی ہے لیکن ان قدروں کے انکشاف کا سفر نفی سے اثبات کی طرف جاری ہوتا ہے۔ یہ عورتیں نامکمل دیوی ہوتی ہیں اور نہ پوری طرح شیطان۔"۱۲

وارث علوی کے مطابق منٹو وہ پہلا افسانہ نگار ہے جس کا یہ اہم فلسفہ نظریہ ادب ہے کہ جنس کو ایک صحت مند جبلت کے طور پر قبول کرنا نارمل معاشرے کا کام ہے۔ اسے گناہ کے تصور سے جوڑنا ہیں وہ مذہبی نقطہ نظر ہے جس نے اس اس کے خدوخال کو مسخ کر کے چھوڑ گیا گیا ہے اب عالم یہ ہے کہ طوائف خدا اور روح سے متعلق سوال کرتی ہیں اور بظاہر مذہبی لوگ ان طوائفوں سے مطلوب خانے کے لیے بے چین۔ وارث علوی منٹو کو تفہیم کے سلسلے میں بڑی فکر انگیز باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں بلاشبہ منٹو کا وارث علوی جیسا نقاد میسر آنا چاہیے تھا اور منٹو کی تعلیم سلسلہ میں ایک بڑی کمی قوالی سال میں نے اپنی تخلیقی تنقید سے پورا کیا۔ یہ تنقید فکری حوالوں سے اردو میں مباحث کے نئے امکانات کو فروغ دیتی ہے اور تحقیق کرنے والوں کے لئے تلاش اور جستجو کے نئے در وا کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وارث علوی، غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین، قلم پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹۵
۲۔ وارث علوی، منٹو ایک مطالعہ، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۳، ص ۱۲
۳۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص ۱۳
۴۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص ۳۰
۵۔ وارث علوی، بر ژواژی بر ژواژی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۱۹۹۹، ص ۲۶
۶۔ وارث علوی، منٹو ایک مطالعہ، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۸
۷۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص ۱۸۹
۸۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص ۶۰ تا ۶۲
۹۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص ۹۶ تا ۹۷
۱۰۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص ۱۱۹
۱۱۔ عابد علی عابد، اصولِ انتقاد ادبیات، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰، ص ۶۲۳
۱۲۔ ڈاکٹر پرویز شہریار، منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور، پرنٹ یارڈ پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۲۱، ص ۱۶۸،